

”اس وقت؟... اپنے خاوند کے ساتھ... امریکہ میں... اپنی بیٹی کے ساتھ.. دو روز ہو گئے ہیں۔“

”اور وہ صحت مند اور خوش ہے؟“

”ہاں... اور فون پر مجھ سے بات کرتی رہتی ہے.. اور اس نے کبھی آپ کا حوالہ نہیں دیا.. وہ وہاں سے کوچ کر کے آگے چاچکی ہے جہاں آپ تھے.. میں آپ کے لئے کافی کا ایک کپ بنا کر لاتی ہوں...“

دھمک... دھمک... ٹھک... ٹھک...

کشتی تیز ہواؤں کے آگے بے بس سندھ کے پانیوں پر ڈولتی کھونٹے سے بندھے کسی اڑیل تیل کی مانند کناروں کے ساتھ سر ٹکراتی تھی.. جیسے اکلوتے بیٹے کی مرگ پر ایک ماں اس چوکھٹ پر سر پٹختی ہے جسے پار کر کے وہ آخری بار گھر سے نکلا تھا۔

خاور ایک سیمن کی طرح جو معبد کے ستونوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا، خیمے کو سہارا دیتا تھا اور باہر فہیم کی دیگچیاں اور سرور کی پرات ہواؤں میں اڑتی پھرتی دھنیں بجاتی سنائی دیتی تھیں..

ہواؤں کی شدت میں تو کمی نہ ہوئی البتہ اس کے بازو تھک گئے... اور اس کا سر نیند سے بو جھل ہونے لگا... کشتی ہوا میں معمول ہو گئیں۔

سرور اور اماں جعفر کشتی کو قابو میں رکھنے کی سعی کرتے.. گال مندا کرتے ہواؤں کے سنگ ان کے سر میں سُرماتے شور کرتے تھے..

دریا کے ریتلے کنارے ایک مہیب آواز کے ساتھ پانیوں میں گرتے تھے۔ جیسے ان میں کسی نے چھلانگ لگا دی ہو.. ان کا ریتلا بوجھ پانی میں گرتا تھا اور ہولناک گونج کو جنم دے کر گم ہو جاتا تھا..

بہن ہے... بہن ہے سائیں.. یہ کون پکارتا تھا..

نیند کی مدہوشی میں... سلپنگ بیک میں سر لیٹے بدن کی تھکن اور پچھلی رات کے جگراتے میں.. اس نے بمشکل کروٹ بدلی..

ہاں وہ فون پر مجھ سے بات کرتی رہتی ہے.. اس نے کبھی آپ کا حوالہ نہیں دیا.. وہ وہاں سے کوچ کر کے آگے جا چکی ہے جہاں آپ تھے..

سائیں ہم تو آپ کے مرید ہیں، آپ کی چوکھٹ پر حاضری دینا چاہتے ہیں.. حکم کریں سائیں..

جھکڑ اور تیز ہوائیں صبح تک چلتی رہیں.. ان میں کمی نہ آتی تھی.. پو پھنی تو جیسے وہ اسی کی منتظر تھیں۔ یکدم سکون ہو گیا.. ہر شے اٹھل پٹھل اور بے چینی اور بے اختیاری سے نکل کر سکوت میں آ گئی.. سب کچھ ٹھہر گیا.. کشتی کناروں سے ٹکرا کر اب ایک نامراد عاشق کی طرح ستار ہی تھی.. جنوں رخصت ہو چکا تھا.. سب چہروں پر ریت اور ہواؤں کی ٹندی کی نشانیاں تھیں اور پونے ان کے بوجھ سے بمشکل کھلتے تھے... برتن اور دیگیں.. پچکے ہوئے.. فہیم سر جھکائے انہیں جھاڑیوں میں تلاش کر رہا تھا..

کنارے کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی مردہ مچھلیاں پڑی تھیں.. کہیں کہیں کسی ایک کی دم لہہ بھر کے لئے پھڑکتی..

سرور نے بانس پانی کے سینے میں اتارا.. کشتی نے کنارے سے ٹکرا کر اپنے آپ کو پرے کیا اور سندھ کے بہاؤ میں آ گئی..

ابھی نو پھٹ رہی تھی.. نیم تاریکی بہت سچے سے منظر کا دامن چھوڑ رہی تھی.. اس کی آنکھوں میں بھی ریت اور نیند کے جھوکے تھے.. پونے کھلتے نہ تھے..

”میں آرام کرتا ہوں فہیم.. مجھے ڈسٹرب نہ کرنا“

”ٹھیک ہے سائیں... رات بہت بے آرامی رہی.. آپ ریٹ کرو“

سندھ کی ندیاں دھیرے دھیرے بہتی تھیں اور کشتی اسی دھیرے سے اس میں بہتی تھی اور خاور اس کے ہلکوروں میں اپنے بدن کے تھکاؤ اور جگر اے کو زائل کرنے کے لئے داخل ہوا اور عارضی موت کے تجربے کے اندر اتر گیا..

ان گنت عارضی پڑاؤ تھے جو غازی گھاٹ سے بھٹنے کے بعد رات کے بیسروں کے لئے آئے.. سروٹوں کے گھنے ذخیرے.. ریتلے ٹاپو، بے آباد جزیرے، پرندوں کی چراگاہیں.. ایسے ٹیلے جن پر صرف ایک دو خیمے بمشکل جگہ پاتے تھے اور فہیم احتیاط سے جھومر ڈالتا تھا کہ کہیں پانی میں نہ گر جائے.. یہ سب عارضی پڑاؤ تھے اور وہ انہیں اپنی ضرورت کے مطابق استعمال

کرتے تھے.. ان کی ریت کو روندتے تھے، 'الاؤ جلا کر ان کے بدن کو سیاہ کرتے تھے.. خالی ڈبے،  
پلاسٹک کی بوتلیں.. ہڈیاں.. شاپر.. ان کے کنوار پن پر بکھیر کر انہیں چھوڑ دیتے تھے..

اور جب اگلا پڑاؤ آتا تھا تو پچھلا پڑاؤ انہیں یاد بھی نہیں رہتا تھا..

میں جانتی تھی کہ یہ ایک عارضی پڑاؤ ہے، وہ زیادہ دیر یہاں قیام نہیں کرے گی۔  
عابدہ سومرونے بھی اسے استعمال کیا تھا... اس کے بدن پر جھوٹ اور نفسیاتی  
عارضے کے 'الاؤ جلا کر اسے شب بھر کے لئے استعمال کیا تھا... اسے یوقوف بنایا تھا اور وہ بن  
گیا تھا.. شہلا آفریدی درست کہتی تھی.. ایک ادھیڑ عمر کے مرد کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا..  
پیچھے ہٹ جانا چاہئے تھا..

لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی..

پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا..

انسان ہمیشہ سے ایک عارضی پڑاؤ رہا ہے... ہر انسان یہی سمجھتا ہے کہ دوسرے  
قصود وار ہیں... اس کی بیوی کو اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا.. وہ زندگی کے ایجنڈے میں ایک  
آئٹم تھا جو گھریلو اخراجات کا بندوبست کرتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے.. اور یہ بچے بھی اس کے  
عارضی پڑاؤ میں ذرا ٹھہرے اور کوچ کر گئے.. ان میں سے ہر فرد اس لمحے جب وہ اس میں قیام  
کرتا تھا انتہائی بے لوث تھا اور اس سے محبت کرتا تھا.. اس قیام کے دوران کہیں کوئی  
خود غرضی شامل نہ تھی.. اس کی بیوی نے بھی اسے بہت احتیاط اور لگن سے سنبھال سنبھال  
کر رکھا تھا.. بچے بھی اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے اور ان کی ہانہوں کا لمس اس سے جدا نہ ہوتا  
تھا.. لیکن وہ ایک عارضی پڑاؤ ہی تھا.. اگر عابدہ سومرونے بھی اسی تسلسل میں اسے استعمال  
کیا.. اگرچہ ان لمحوں میں اس کی محبت میں بری طرح الجھی رہی.. تو یہ پہلی بار نہ تھا..

اور غلامی آنکھیں بھی اسی تسلسل کی ایک کڑی تھیں.. وہ بھی تو ایک غلام ڈھونے  
والے سمندری جہاز کے کیپٹن کی طرح تھی جو اپنے خاوند اور بچوں کے عارضی پڑاؤ سے نکل  
کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے چلی جاتی تھی..

سلطانہ کی زندگی میں بھی ایسے ان گنت پڑاؤ تھے.. اپنے کچے گھر کے صحن میں  
سائیکل کی گھنٹی پر اپنا ننھا مانا انگوٹھا رکھتی ہوئی.. اوڑک کے باغوں میں.. امریکہ کے فٹ پاتھوں

پرانندھی پڑی قہقہے لگاتی اور ایک ایرانی ٹیکسی ڈرائیور کے ایک فقرے کی سچائی پر ایمان لا کر اپنی زندگی کا نقشہ بدلتی ہوئی.. جو ڈاکٹر ہاشم کے عارضی پڑاؤ سے اٹھ کر اس کی خیمہ بستی میں آنے کو تیار تھی.. اور اس عمر میں اس کا پڑاؤ تو قدرتی طور پر بے حد عارضی تھا..

ہر انسان یہی سمجھتا ہے کہ وہ عارضی پڑاؤ کے طور پر استعمال ہوا جب کہ دوسروں کو اس سے بھی یہی شکایت ہوتی ہے..

نابھن ہے... نابھن ہے سائیں.. یہ کون پکارتا تھا..

خاور نے کروٹ بدل کر اس آواز پر کان دھرا اور ابھی تک ریت بھری آنکھوں کے پوٹوں کو اوپر کیا.. کشتی کے پلیٹ فارم پر سرور اور جعفر کے سیاہ پاؤں نہیں تھے، نہیم جھکا ہوا تھا۔ ”سائیں آپ کو ڈسٹرب کیا ہے مگر جاگ جاؤ.. کیا خوش بخت دیہاڑا ہے.. سندھ سائیں کے سینے پر اندھی ڈولفن ابھرتی ہے اور نظارہ کراتی ہے.. سائیں باہر آ کر دیدار کرو.. منظر کشی کرو..“

خاور باہر آگیا۔

سندھ سائیں کا وسیع حوصلہ مند سینہ ہموار تھا.. پانیوں کی ایک کچھ کچھ بہتی چادر تھی جس پر پو پھننے کے بعد ابھی ابھی سورج کی زرد کرنیں اتری تھیں اور اس چادر کو نیم سنہری رنگتی تھیں.. جہاں تک نظر کام کرتی تھی وہاں تک صرف پانیوں کی کسمپاسی چادر تھی اور اس پر کوئی ایک لہر.. کوئی ایک کروٹ دکھائی نہ دیتی تھی..

”ابھی نظر نہیں بناؤ سائیں.. دیکھتے رہو.. دیدار کرائے گی سائیں..“ نہیم بُت بنا.. آنکھوں کو پتھر کئے ادھر ٹکٹا جا رہا تھا.. سرور اپنے بانس کو بھولے ایک عقیدت اور حیرانی کو اپنے سیاہ چہرے پر نقش کئے پانی کی ہموار اور ابد تک جاتی چادر کو دیکھتا جاتا تھا.. آنکھیں نہیں جھپکتا تھا.. جعفر بھی اسی حالت میں تھا.. وہ دونوں پانیوں کو ایسے تکتے تھے جیسے ان میں سے خواجہ خضر کا ظہور ہونے کو ہے..

”نظارہ کرو سائیں..“ نہیم یکدم چیخا اور سندھ کی چادر کے جس حصے پر خاور نظریں جمائے ہوئے تھا اس سے بالکل مخالف سمت میں اشارہ کیا..

جتنی دیر میں پلیٹ کر اس نے ادھر نگاہ کی.. وہاں کچھ بھی نہیں تھا.. البتہ وہاں چادر

میں وہ ہمواری برقرار نہ تھی.. وہاں کچھ تلاطم کچھ ہلچل اور کروٹیں تھیں..  
”کدھر فہیم“

”سائیں وہ غوطہ لگا گئی ہے.. ابھی ابھرے گی.. بس نظر بھر کر دیکھتے رہو.. جدھر ڈوبی ہے اوھر سے ذرا آگے نظر رکھو.. سانس لینے کے لئے اوپر آئے گی اور نظارہ کرائے گی..“  
کشتی آپو آپ اپنی من مرضی سے ڈولتی بہتی جاتی تھی..  
وہ آرگوس کے سحر زدہ ملاح تھے جنہوں نے سائرز کے گیت سن لئے تھے..

ایک مدت گزر گئی.. اس کی ریت بھری آنکھیں تھکنے لگیں..  
صرف کچھ تھی جو اس انتظار میں شامل نہیں تھی.. بلہن کو دیکھنے کی چاہت نہ رکھتی تھی.. وہ اس گہما گہمی سے لا تعلق کشتی کے پچھلے حصے میں گونٹھ مارے حسب معمول اپنا جھگاٹھا کر اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی.. صرف ایک بار اس کی سیاہ آنکھوں نے اس تک سفر کیا لیکن اس کے سانسوں کی ہواڑ میں اب دعوت کی وہ گرمی نہ تھی کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ اس سائیں میں وہ بات نہیں ہے جو اسے میل کرنے پر مجبور کر دے..

کرنیں تیز اور روشن بحالوں کی طرح پانی میں اتر کر بجھتی جاتی تھیں.. اور اسی پانی میں سے یکدم آنکھ کے جھپکتے ہی ایک سرمئی رنگت کی پشت کا ابھار بلند ہوا.. آبی چادر کی ہمواری چاک ہوئی اور اس میں سے انڈس ڈولفن کا ناپیدا وجود ابھرا.. اس کی گیلی پشت پر کرنیں پھسلتی گئیں..

خاور کا دم رک گیا.. یہ ایسا پر شکوہ منظر تھا.. آنکھوں میں ریت کے جو ذرے تھے وہ موم ہو گئے اور اب وہ کوشش بھی کرتا تو اپنے پپوٹوں کو جھپکا نہیں سکتا تھا..

ڈولفن ابھرتی گئی.. حیلے بدن پر سورج کو وصول کرتی ہوئی.. روشن ہوتی ابھرتی گئی اور پھر اس کی اندھی تھو تھنی پل بھر کے لئے پانیوں سے باہر آئی اور پھر اسی پل میں وہ تمام کی تمام پھر سے ڈوب گئی.. آبی چادر پر اس کے عارضی پڑاؤ کے چند ہلچلے اور لہریں باقی رہ گئیں جو فوراً ہی ہموار ہو کر اس کی موجودگی کے امکان سے منحرف ہو گئیں..

”اب اوھر نظر کرو سائیں..“ فہیم نے وہاں سے نگاہیں ہٹائیں اور کشتی کے عین برابر میں اپنی توجہ مرکوز کی۔ ”اوھر آئے گی“

اور وہی ڈولفن اب کے ابھری تو کشتی کو تقریباً اپنے کندھوں سے دھکیلتی پانی سے

نکلی... اس کی تھو تھنی باہر آئی تو بے چراغ اور بے نور تھی..

وہ نہیں دیکھ نہیں سکتی تھی، محسوس کر سکتی تھی کہ وہ وہاں ہیں..

وہ ڈولفن اگرچہ چند لمحوں کے لئے نمودار ہوئی لیکن اس کی نظروں کے سامنے وہ جیسے ساکت ہو گئی... وہی سی آر پر چلنے والے کسی نظر کی مانند ریوٹ کا بٹن دبانے سے ٹھہر گئی... تصویر ہو گئی.. اور پھر دوبارہ اسی بٹن کے دبانے سے متحرک ہو کر غراب سے پانیوں میں ڈوب گئی.. یہ ڈولفن آپر کا آغاز تھا..

پانیوں کے اندر جانے وہ کتنی تھیں..

پھر سندھ کی آبی چادر تار تار ہونے لگی.. وہ جا بجا ابھرتی تھیں.. شعاعوں کی زد میں آکر روشن ہوتی تھیں اور پھر ڈوب جاتی تھیں..

جیسے وہ ایک پر فار منس دے رہی ہوں.. سدھائی ہوئی ہوں.. اور صرف ان کے لئے جو ایک کشتی پر سوار ان کی آماجگاہ میں آنکلتے تھے، پر فارم کر رہی تھیں..

ان کے رنگ سرمئی تھے.. لیکن کشتی سے دور ایک طویل فاصلے پر ایک بہت بڑی جسامت کی ڈولفن سانس لینے کے لئے پانیوں میں سے باہر آئی تو وہ برف سفید تھی.. وہ کوئی موبلی ڈک تھی..

نہیں.. موبلی ڈک تو ایک قاتل و ہیل تھی، اس کے اندر کیپٹن اہاب کی ٹانگ کے علاوہ متعدد کشتیوں کے تختے اور ملاحوں کے بدن تھے جنہیں وہ نگل چکی تھی..

اس ڈولفن نے کوئی ایسی واردات نہیں کی تھی..

وہ تو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی.. واردات کیسے کر سکتی تھی..

وہ سفید ڈولفن بار بار ایک ہی مقام پر ظاہر ہو رہی تھی اور خاور اس کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ کشتی اس کے قریب ہو جائے.. وہ اس کے لشکیلے سفید بدن میں کوئی ہارپون گاڑ کر... کوئی نیزہ اتار کر اسے مارنا نہیں چاہتا تھا.. بلکہ اسے اپنی نزدیک ترین قربت میں دیکھنا چاہتا تھا.. کہ جب وہ پانیوں میں سے جنم لیتی ہے تو اس کی تھو تھنی پر جہاں اس کی آنکھیں ہونی چاہئے تھیں وہاں اگر کچھ بھی نہیں ہے.. تو کیا اس قربت میں وہ اس کی موجودگی کو محسوس کر سکتی ہے کہ وہ وہاں ہے.. خاور وہاں ہے... اور اس کا گھر مسمار ہو چکا ہے... وہ بے سہارا اور بے گھر ہے.. اور اس کی حیات ایک عارضی پڑاؤ ہے...

یہ جاننے کے لئے اسے سفید ڈولفن کی مسائیل کی چاہت تھی..  
 سندھ کے پانی ان کے بار بار ابھرنے سے جیسے ابل رہے تھے..  
 انہیں سانس نہ آتا تھا کہ ہر لحظہ ان میں سے کوئی ایک ڈولفن سانس لینے کے لئے  
 کھلی فضا میں پہلے اپنی پشت نمودار کرتی تھی اور پھر اپنی تھو تھنی بلند کرتی تھی... ناپیدائی کی  
 بے چارگی سے بلند کرتی تھی... ایک وہیل کی طرح ظاہر ہوتی تھی اور ڈوب جاتی تھی..  
 سرور اور جعفر جو عام حالات میں گھریلوں کی طرح زُر زُر کرتے رہتے تھے خاموش  
 کھڑے انہیں تکتے جاتے تھے..

”سرور...“

”جی سائیں..“ وہ گھبرا کر اپنے سکوت میں سے باہر آیا..  
 ”تم پانی کے پونگ ہو.. سندھ سائیں میں سے ہی اپنا رزق نکالتے ہو تو کبھی اسے  
 بھی شکار کرتے ہو۔“

”نہ سائیں نہ..“ سرور نے کانوں کی ٹوپی چھو کر جیسے ایک عظیم گناہ کے لئے معافی  
 مانگی۔ ”نہ... باہن کو پکڑنا تو گناہ ہے سائیں... پر کبھی گناہ ہو جاتا ہے.. ہم لوگ رات کے  
 وقت مچھلی کے شکار کے لئے دریا میں جال ڈال کر چلے جاتے ہیں اور جب سویرے وہاں آتے  
 ہیں تو... کبھی سال دو سال بعد ایسا ہو جاتا ہے کہ اس جال میں باہن بھی پھنس جاتی ہے.. اور  
 وہ ہمیشہ مردہ حالت میں ملتی ہے کیونکہ پانی کے اندر باہر آکر سانس لینے کے بغیر وہ زیادہ دیر  
 تک زندہ نہیں رہ سکتی... جال میں پھنس کر پوری رات نہیں نکال سکتی اور مر جاتی ہے.. تو  
 ہم توبہ کرتے ہیں کہ اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ہوتا.. ہم تو باہن کو بڑا سائیں مانتے  
 ہیں.. کیونکہ جب یہ نظر میں آوے تو ہمیں شکار ملتا ہے.. اس کا دیدار مبارک ہوتا ہے..  
 جان بوجھ کر کبھی نہیں مارتے... اب سو بنازب اس کی قضا لے آوے تو بھی ملول ہوتے  
 ہیں...“

سندھ کی چادر لیرو لیرو ہو رہی تھی..

اس میں ایک مسلسل تناطم کی کیفیت تھی... ان کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہ  
 تھی.. مگر وہ جا بجا ابھرتی... انگھیلیاں کرتی.. ذوقی ابھرتی.. قلیلیں کرتی تھیں..  
 ”یہ تو ادھر گھر بنائے کھڑی ہے سائیں...“ سرور کا جٹ انہیں دیکھنے کے ہیجان

سے ذرا کانپتا تھا۔ ”اوہر پانیوں کا میل ہو رہا ہے ناں... تو بیچ میں جہاں دونوں دھارے زور کرتے آتے ہیں اور ان کا ملاپ ہوتا ہے تو اوہر کچھ علاقہ ایسا بنتا ہے کہ اس میں پانی کھڑے ہوتے ہیں جیسے گھڑے میں ہوں تو ان میں مچھلی بہت آتی ہے اور بلہن جو ہے اسے کھانے کے شوق میں خاص طور پر اوہر آ جاتی ہے.. گھر بنائے کھڑی ہے سائیں..“

ایک اور سست اور لا پرواہ ڈولفن نے پانی میں سے ابھار کیا لیکن اس کی تھو تھنی باہر نہ آئی اور وہ ایک سمندری جہاز کی طرح بہت دھیرے دھیرے پانی میں ڈوب گئی..  
اماں جعفر ابھی تک کچھ نہیں بولا تھا..

وہ ایک ایسا ملاج تھا جو پانیوں کے گہرے بھید نہ کھولنے کا وجہ دے چکا تھا اور کچھ نہیں بولتا تھا.. کبھی اپنی حیاتی میں بہت کچھ دیکھ چکی تھی.. اُس کے بدن کی ریت بہت بار عارضی پڑاؤ کے طور پر استعمال ہو چکی تھی اور وہ بھی کچھ نہیں بولتی تھی، بچے کو چٹائے بیٹھی تھی..

”اماں...“ سرور اپنے بلہن کے دکھاوے کے مسرت آمیز بیجان میں شرارت سے پکارا۔ ”تو نہیں بولتا... ہم تو تیرے بال ہیں بڑے کہتے تھے کہ تو نے ایک بار بلہن کو گھر والی کیا تھا..“

جواب میں اماں نے اپنی ٹھیلے زبان میں اس کے ساتھ کچھ گال مندا کیا لیکن اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکا..

فہیم جو پچھلی رات کے جھکڑ میں برتنوں کے پچک کر ناکارہ ہو جانے کے رنج میں تھا، یکدم کھل اٹھا۔ ”ہاں جعفر یہ کیا قصہ ہے.. بلہن گھر والی کیسے ہو سکتی ہے.. ہیں؟“

”سائیں کے سامنے تو زبان نہیں کھلتی فہیم...“ جعفر نے چھاتی کو شرمندگی سے کھجایا ”اور بتانے کی بات بھی نہیں یونہی مشہوری ہو گئی ہے.. جوانی میں بہت نادانی ہوتی ہے.. بندہ جنور ہو جاتا ہے پر میں نہیں ہوا.. یونہی قصہ بنا لیا ہے..“

ایک اور ڈولفن سندھ کے سینے کو چیر کر اوپر آئی اور پھر پانیوں کو پچھاڑتی ہوئی نیچے چلی گئی..

”سناؤ ناں اماں...“ سرور نے اپنی دائیں آنکھ بند کر کے خاور کی جانب دیکھا اور مسکرائے لگا..

”کبھی تو نہیں سنتی...“ جعفر نے پیچھے مڑ کر تسلی کی اور پھر بولا ”میں بہت چھوٹا تھا ابھی جوانی میں نکل رہا تھا جب میرے دادا کے جال میں ایک بلہن پھنس گئی.. مامن ماسا نے بتایا تھا کہ بلہن... ایک لڑکی کی طرح ہوتی ہے.. اس کے اعضا بھی ایک عورت والے ہوتے ہیں اور اگر تم اسے گھر والی سمجھ کر اس کے ساتھ میل کرو تو ساری زندگی تمہارا زور کم نہیں ہوتا..“

”بلہن کے ساتھ“

”ہاں سائیں.. پر میں جنور نہیں ہوا.. پر یہ قصے مشہور ہیں کہ ایسا ہوتا ہے اور اسی لئے ہمارے ہاں رواج ہے کہ اگر ایک بندہ بلہن کو پکڑ کر لے آتا ہے تو قبیلے والے اسے نہیں کھاتے.. ہاں اگر دو ہوں تب کھا لیتے ہیں کہ پاک ہوگی...“

”ماما اصل بھید نہیں کھولتے... چلو سائیں کوئی کان میں بتا دو کہ کیا ہوا تھا..“  
 فہیم اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ”قصے یونہی تو مشہور نہیں ہو جاتے...“  
 ”ہو جاتے ہیں..“ جعفر کے چہرے پر ناراضگی ابھری..

”اسے بلہن کیوں بولتے ہیں؟“

”ادھر کی بولی میں بلہن کسی چھلانگ لگانے والی شے کو بولتے ہیں اور اگر کوئی مونا اور بد ہیئت شخص ہو اسے بھی کہتے ہیں...“

فہیم اس کے پاس ہوا.. اپنی پرسرت کیفیت کو رخصت کر کے نہایت سنجیدگی سے اپنی آواز مدغم کر کے اسے کہنے لگا۔ ”سائیں برا نہ ماننا پر ایک بات پوچھ لوں... یہ درست ہے کہ سائیں برمانی نے ہدایت کی تھی کہ خاور صاحب جہاں تک جائیں لے جائیو۔ تم نے ان کا ساتھ دینا ہے جب تک یہ خود لوٹنے کو نہ کہیں.. پر سائیں آج سویرے بھی سرور اور جعفر نے مجھ سے بات کی تھی کہ بہت دن ہو گئے ہیں.. صاحب نے گھر کب جانا ہے.. تو سائیں کبھی نہ کبھی تو واپس جانا ہے تو کب جانا ہے.. آپ کا گھر تو ہو گا.. سب کا ہوتا ہے تو کب جانا ہے...“

وہ گئی رات... جب کہ بارہ کہو کے دیہات مکمل تاریکی میں سوتے تھے اور کہیں کہیں ایک آدھ بلب ٹمٹماتا تھا.. مری روڈ اجاز ہو چکی تھی اور سملی ڈیم کو جاتی سڑک پر

دیرانی اور اکلا پے کے سوا کچھ نہ تھا... وہ سفید کاغذوں پر جھکا.. جو ٹیبل یسپ کی تیز روشنی میں کچھ زیادہ سفید ہوتے تھے اپنے ذہن پر بوجھ ڈالتا تھا... ان پر اتارنے کے لئے لفظوں کا چناؤ کرتا تھا جب اس ٹھہرے ہوئے سکوت بھرے سنائے میں اس کے عین سامنے جو ٹبک شیلٹ تھا اس کے اندر ایک گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور بغیر کسی انتباہ کے بل ڈوزر کے آہنی بلیڈ اپنے دانت کھولے دیوار کو ڈھاتے ہوئے اس کی کتابوں، تصویروں اور مجسموں کو مسمار کرتے اس کی کرسی تک آگئے تھے... اس نے بمشکل اپنے آپ کو بلے میں دفن ہونے سے بچایا تھا..

اُس تک آنے سے پیشتر وہ اس کے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں دندناتے انہیں مایامیٹ کر چکے تھے۔

صبح ہوئی تو وہ ایک کھنڈر کے درمیان میں تھا..

اُس کا گھر کسی حد تک غیر قانونی تو تھا کہ اس کا نقشہ پاس نہیں ہوا تھا لیکن اس پاس سینکڑوں گھر اسی طور وجود میں آئے تھے.. اور وہ سب کے سب نہیں گرائے گئے تھے.. بل ڈوزر کے آہنی بلیڈ اندھے نہیں تھے، تخصیص کر سکتے تھے.. وہ دیکھ سکتے تھے کہ کون حیثیت والا ہے.. کسے صرف چھوٹا ہے صرف چار دیواری کو گرانا ہے.. اور کسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینی ہیں اور کسے کھنڈر کر دینا ہے.. جن کے لئے آنکھیں کھلی رکھی گئیں وہ اقتدار کے ایوانوں تک رسائی رکھتے تھے.. جرم کی دنیا میں اہمیت رکھتے تھے.. کچھ سیاست دان تھے اور کچھ سائنس دان اور کچھ فوجی... لیکن اس کی خاور کی کوئی حیثیت نہ تھی... ایک کاغذ کالے کرنے والے شخص کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے.. اس کی وقعت اور تعظیم کیا ہو سکتی تھی۔

بہت سے دوسرے تھے جو آہ و بکا کرتے تھے۔ ان کے بچے سہمے ہوئے تھے اور زندگی کے گلے آٹار بلے میں دبے پڑے تھے.. وہ درخواستیں تیار کر رہے تھے.. حکومت کے ایوانوں میں جوہت تھے ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے.. احتجاج کرنے کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہے تھے.. لیکن اس نے روشنی ہوتے ہی بلے میں سے چند کتابیں نکالیں جو اوندھی پڑی تھیں وارڈروب ابھی سلامت تھی اس میں سے چند کپڑے کھینچ کر نکالے اور انہیں ایک بیگ میں ٹھونس کر اس کھنڈر میں سے نکل گیا.. برمانی اُسے یکدم چوٹی زیریں میں

اپنے سنج میں اپنے سامنے پا کر حیران رہ گیا تھا "سامیں آپ کدھر؟"  
 "سندھ سامیں پر گھر بنانے آیا ہوں" اُس نے ہنس کر کہا تھا۔

فہیم اپنی نادانی میں یہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص کا ایک گھر ہوتا ہے جہاں اسے بلا آخر لوٹنا  
 ہوتا ہے.. اور وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کوئی ایک فرد ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کے پاس لوٹنے  
 کے لئے کوئی گھر نہیں ہوتا... البتہ لمحہ بہ لمحہ گھٹتی ہوئی حیات کے قبضے میں جتنے بھی  
 روز و شب رہ گئے تھے ان میں سلفانہ کی قربت ممکن تھی.. وہ گھر ہو سکتی تھی..

"تو کب لوٹنا ہے سامیں؟"

"آج کہیں رات کر لیں گے فہیم... تو کل سویرے ہم واپس ہو جائیں گے۔"  
 بہت دیر سے کوئی ذولفن سینہ آپ پر نہیں ابھری تھی... وہ بقول سرور پانیوں کے  
 اندر گھر بنائے کھڑی تھیں اور لوٹ چکی تھیں۔

نیم سیاہ رنگت میں سے تیز دانت مسکراہٹ اور سرخوشی میں لٹکاتا فہیم آج پھر  
جھومر ڈال رہا تھا۔ مرغابی کے پنجوں ایسی سیاہ ہتھیلیاں سرور کی تھیں جو پرات پر چنچو چلاتی اس  
میں سے چھم چھم غنائیت ابھارتی تھیں جس پر فہیم کا چکیلا بدن لہریں بناتا ریت پر ناچتا تھا اور  
وہ... سرور منہ کھولے آج پھر ملاج کو پکارتا تھا۔

ملا... ملا... ہالی نہ بیڑی نور ساڑھے یار و بھناں...

ملا... ملا... ماماں جعفر دوری میں بُونی گھوٹا ڈنڈے کی گولائی سے لپٹے  
گھنگھر وڈس کو ملا... حا... حا کی تال پر چھنکا تا اور سر جھٹکتا تھا۔

سندھ کی آبی کائنات میں گہرا سرکنڈوں اور سروٹوں اور دب گھاس سے اتنا ایک گھنا  
ذخیرہ تھا جس کے اندر کہیں ایک ہموار ریتلا ٹکڑا تھا اس ذخیرے میں چھپا ہوا۔ اور یہاں بیٹھے  
ہوئے شاہد بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان قد آدم سرکنڈوں کے پار چند فرلانگ کے فاصلے پر پانی  
شروع ہو جاتے ہیں۔ دریا ہے۔ اور ایک کشتی ہے جسے کنارے پر ٹھونکنے گئے کھونٹوں سے  
آج اتنی مضبوطی سے باندھا گیا ہے جیسے گھیور کو بونوں نے رسیوں سے جکڑ لیا تھا۔ یہ اہتمام  
اس لئے کیا گیا تھا کہ اگر آج پھر پچھلی رات والا جھکڑ پھر سے حملہ آور ہو جائے تو کشتی اپنی جگہ  
پر قائم رہے اور کناروں سے سر کرا کرا کر ہلکان نہ ہو۔

کشتی آج پہلی بار سیاہ رات میں اکیلی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اسے تنہا چھوڑ کر  
اس کے مسافر کہاں چلے گئے ہیں کیونکہ وہاں سے نہ ذخیرے کے درمیان جھومر ڈالتا فہیم  
دکھائی دیتا تھا نہ سرور کی پرات کی دھمک یہاں تک آتی تھی اور نہ الاؤ کی روشنی کی کوئی خبر ملتی  
تھی۔

فہیم سردنوں کے جزیرے کے بیچ ایک اور جزیرے میں جھومر ڈالتا تھا اور الاؤ کی روشنی سے سرکنڈوں پر سائے وجود میں آتے تھے جو حرکت کرتے رقص کرتے تھے جیسے وہ سائے فہیم کے ساتھی ہوں اور پس منظر میں اس کی پیروی کر رہے ہوں۔ اس کی سنگت میں ہوں۔ پگلی ہوئی دیگچیاں۔ ایک ہانڈی۔ کچھ برتن آگ کے کناروں پر رکھے ہوئے تھے تاکہ ان میں سنگھاڑا مچھلی کا جو سالن ہے۔ بھنی ہوئی مرغی اور شدید پیٹھا حلوہ اور پراٹھے ہیں وہ ٹھنڈے نہ ہو جائیں کوئلوں کی قربت میں گرم رہیں۔ کہ ابھی تو بوٹی کا دور لگ رہا تھا کھانے کی باری بعد میں آتی تھی۔

اور انہیں کھانے سے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی۔

بوٹی ان کے اندر مشک مچا رہی تھی۔ اور وہ لا پرواہ ہو چکے تھے۔

ریت پر رقص کرتا ایک اونٹ کی طرح پاؤں آگے پیچھے جمانا فہیم دونوں ہاتھ پھیلائے جھومر ڈالتا ہوتا کچھی کے پاس ہوتا گیا جو بظاہر ان سے لا تعلق بیٹھی تھی لیکن بوٹی کے چند گھونٹ جو اس کے حلق سے اترے تھے وہ اسے بھی ایک خاص لہک اور مستی سے دوچار کرتے تھے اور وہ کن اکیوں سے کبھی نکلتی تھی۔ ”پکھیے۔ آ جا۔ آ۔“ فہیم نے جھک کر اس کے دونوں ہاتھ جکڑ لئے۔

سرد نے پرات سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور خوش ہو گیا۔ پوری بیٹی نکال کر پرات پر زور سے ہتھیلی مار کر تال دی اور پھر کسی دبلے سے بن مانس کی طرح چیخا ”چل اوئے پکھیے۔“

پکھی فہیم کے جکڑے ہوئے ہاتھوں سے بندھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور وہ ہنستی جاتی تھی۔ اس ہنسی نے اس کا مہاندہ بدل دیا اور وہ خادر سے پہچانی نہ گئی۔ وہ صرف اس ہنسی سے ایک مختلف عورت ہو گئی تھی۔ فہیم نے اس کے بازوؤں کو اونچا کیا اور پھر انہیں چھوڑ کر اس کے گرد ناچنے لگا۔ سرد کی پرات کی تال سے پکھی کا بدن واقف تھا اس کی سر میں تھا۔ اس لئے وہ نہایت آسانی سے اس کے ہمراہ حرکت کرنے لگی۔

اماں جعفر بھی نہ رہ سکا اور ”پکھی اوئے پکھی“ کہہ کر بوٹی گھونٹنے والا ڈنڈا دونوں ہاتھوں میں تھام کر اٹھا اس کے گھٹکھرو چھٹکا تا فہیم کی طرح قدم آگے پیچھے رکھتا ان دونوں کے گرد چکر کاٹتا جھومر ڈالتے لگا۔

رات کی اجازت اور بے آباد سیاہی میں الاؤ کی ٹہنیوں کے چلنے سے ان کے سلگنے، ٹوٹنے اور کوئلہ بن کر رکھ ہونے کی آوازیں اور سر سر اہٹ جنم لیتی تھیں... جیسے کائنات کا سکوت ہولے ہولے ٹوٹتا ہو۔ اُس میں دراڑیں پڑتی ہوں... اور ان تینوں کے پرچھائیاں الاؤ سے دور سرکنڈوں پر بے حساب ہوتی تھیں، لاقعدا و متحرک ہجوم ہوتی تھیں جیسے وہاں ایک اور دنیا ہو... ان کے بیٹے ہوئے جتنے جنم تھے ان کے سائے رقص کرتے ہوں... ہزاروں برسوں کی تنہائی اور گمشدگی سے تنگ آئے ہوئے جنم آج کی شب ظاہر ہو گئے ہوں... لیکن ان کے قریب نہ آتے ہوں ذرا فاصلے پر رہتے سروٹوں پر حرکت کرتے سائے ڈالتے جھومر ناپتے ہوں...

اُن کی سرخوشی اور بے حجاب مسرت کا سبب صرف بُوٹی کے گھونٹ نہ تھے... وہ کل سویرے اس بے جواز مسافت کو ترک کر کے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے... غازی گھاٹ کے ساحل کو واپس جا رہے تھے... فہیم اپنے نور پور جا رہا تھا... کچھلی چند راتوں میں ان کے جوڑاؤ تھے ان کے جوڑیرے تھے ان میں پہلے پہل کی رونقیں نہیں تھیں، خاموشی اور ٹھہری ہوئی اداسی اتر چکی تھی... وہ صاحب کے لئے اپنے فرائض سرانجام دیتے تھے... اس کی چاکری کرتے تھے... کشتی کہتے تھے، کھانا بنا کر خیمے لگاتے تھے اور ایک وہم کے ساتھ سو جاتے تھے... انہیں وہم تھا کہ یہ سائیں کوئی بلا ہے... بھوت پریت کا سنگی ساتھی ہے جو ہمیں اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا جانے کہاں لے جا رہا ہے... جانے ہم لوٹتے بھی ہیں یا نہیں... نہ یہ پرندوں کا شکاری ہے... نہ دارو کا شوقین ہے اور نہ اس نے کبھی پر نظر کی ہے... چنانچہ یہ صرف ساوی کے گھونٹ نہ تھے... وہ اپنی رہائی پر خوش تھے...

وہ آج تک کناروں پر ہی قیام کرتے تھے... جس ناپور پر رات بسر کرنے کا فیصلہ ہوتا اس کے کنارے کشتی باندھتے اور اسی کے قریب چولہے جلاتے... خیمے نصب کرتے اور الاؤ روشن کرتے لیکن آج وہ کشتی کو چھوڑ کر ادھر گھنے ذخیرے کے اندر رات کرنے کے لئے آگئے تھے...

”سائیں کناروں پر تو ہمیشہ منظر کشی کرتے ہیں...“ فہیم نے اس سے اجازت مانگی تھی۔ ”آج آخری بار الاؤ جلاؤں گے تو ذرا ادھر سروٹوں کے اندر چل کر رات کرتے ہیں“ منظر کشی ادھر کرتے ہیں... ہوا بھی کم ہوگی اور منظر بھی عجیب ہوگا...”

انہیں رہائی کی نوید مل چکی تھی اس لئے وہ مسرت سے لہریز ہو رہے تھے۔  
 خاور کے آئندہ دنوں میں ایک کھنڈر تھا اور واپسی کا خوف ایک تیندوے کی طرح  
 اس کی ایک ایک رگ سے لپٹ کر اس کا سانس روکتا تھا۔ اُس نے کہاں واپس جانا تھا۔

کراچی سے واپسی پر وہ بہت دن ایک بے یقین کیفیت میں بے حس رہا۔۔۔ جیسے  
 مصنوعی مانگوں والا ایک شخص اپنے نچلے دھڑ میں کچھ بھی محسوس نہیں کرتا۔  
 یہ محبت میں ہزیمت نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ وہ عابدہ سومرو کے عشق کے  
 زیرِ آب جال میں ایک اندھی ڈولفن کی طرح بھنس گیا تھا۔ وہ تو اس کی موت کے خدشے  
 کے چنگل میں الجھ کر اس کے قریب ہوا تھا۔ وہ اس کے لئے رویا تھا۔ اس کی خرخراتی آواز  
 اور قربت مرگ اس کے دل میں چھید ڈالتی تھی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر انکا سورج کا سُرخ  
 وجود ان دونوں کو جنس اور محبت کے ملاپ میں یک جان ہوتے نہیں بلکہ متوقع موت کی  
 آخری رسوم میں الجھے ہوئے دیکھتا تھا۔ اور پھر یکدم شہلا آفریدی نے اسے برہنہ کر دیا۔ اس  
 کے پاس سوائے شرمندگی کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ ایک عارضی پڑاؤ پر ایک شب گزار کر وہ  
 آگے چلی گئی تھی۔۔۔

بہت دنوں سے غلامی آنکھوں کا فون بھی نہیں آیا تھا۔۔۔ لاہور سے کراچی تک  
 کے سفر میں جہاز میں جو قعود ہوا تھا اس کے بعد وہ احتیاط کرنے لگا تھا۔ اس کے فون کا جواب  
 نہ دیتا تھا۔ وہ ”ہیلو“ کہنے کے بعد منتیں کرنے لگتی تھی کہ اب ایسا نہیں ہو گا لیکن اس کا کچھ  
 اعتبار نہ تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو پاگل خانہ کہتی تھی تو ایک پاگل خانہ کا کیا اعتبار اور پھر وہ پہنچ گیا  
 تھا۔ باقاعدگی سے تو نہیں کبھی کبھار اُس سے مل لیتا تھا لیکن اب بہت دنوں سے اُس کا فون  
 نہیں آیا تھا۔ اور اب اس کی دلی تمنا تھی کہ اس کا فون آجائے اور وہ اپنے زیرِ پو ائٹ پر  
 کھڑے ہو کر۔۔۔ چکن ٹو مینو سینڈوچ چباتے ہوئے۔ بارہ کھو کے دیہات میں اولین ہلب  
 روشن ہوتے ہوئے۔ دیکھتے۔ مخروط دم والے کرلے کو ریگتے۔ دیکھتے۔ اسے عابدہ سومرو کی  
 اصلیت کے بارے میں بتائے۔ اسے اپنی شرمندگی میں حصہ دار بنائے۔۔۔

خاور اس کے رد عمل کو جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے عابدہ کے نفسیاتی بہاؤ اور  
 اس سے لا تعلق موت کی قربت۔۔۔ عدم اور نیستی کی داستانوں کے بے بنیاد ہونے پر نہایت

خوش ہونا تھا.. اپنی غلامی آنکھوں کو جھپکتے ہوئے مسلسل رونا تھا اور خوش ہونا تھا.. اور اس کے باوجود وہ اسے اپنی شرمندگی کا حصہ دار بنانا چاہتا تھا..

ٹیلی فون نمبر اس کے پاس موجود تھا کیونکہ ایک روز جانے کس کیفیت میں اس نے کہا تھا کہ.. تمہارے پاس میرا نمبر تو ہونا چاہئے.. لیکن آج تک وہ اس کی انگلیوں سے ڈائل نہیں ہوا تھا اس لئے کہ وہ اس کی پرائیویسی کا احترام کرتا تھا.. یہ طے تھا کہ صرف وہی اسے ٹیلی فون کرے گی..

لیکن بہت دنوں سے.. اتنے دن کبھی نہیں گزرے تھے.. اس کا فون نہیں آیا تھا۔ بل ڈوزر کے بلیڈ کی آمد سے پہلے جب اس کے آس پاس دیواریں تھیں اور سر پر چھت تھی اور ایک گھر تھا.. خاور نے آخری فون اسے کیا تھا..

”جی ہیلو..“ کسی مرد کی روکھی اور بے روح آواز تھی۔

وہ جھجک گیا.. جواب میں کیا کہے... کہتے کہتے رک گیا اور فون بند کر دیا.. وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا تو وہ کیا کہے کہ کس سے بات کرنی ہے..

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر ڈائل کیا..

”جی ہیلو..“

”آپ.. کون بول رہے ہیں؟“

”آپ نے کس سے بات کرنی ہے..“ لہجے میں تھکاوٹ اور بیزارگی تھی.. شاید

اس کا بیٹا تھا..

”آپ کی والدہ اگر گھر پر ہیں تو...“

”آپ کون بول رہے ہیں؟“

”جی میرا نام خاور ہے اور... میں ان کو جانتا ہوں.. آپ.. آپ ان کے بیٹے بول

رہے ہیں؟“

”جی...“ لہجے میں شناسائی آگئی۔ ”جی.. میں آپ کو جانتا ہوں سر.. آپ سے مل

چکا ہوں ایئر پورٹ پر.. جب اماں کراچی جا رہی تھیں اور میں نے آپ سے ریکورسٹ کی تھی

کہ آپ ان کے برابر میں بیٹھ جائیں.. میں سر آپ کو جانتا ہوں..“

”تھینک یو.. تو ان سے بات ہو سکتی ہے؟“

”وہ... اماں تو... جھپٹے ہفتے ان کا انتقال ہو گیا ہے..“

”جی...“

اس فون پر اس تک آنے والی آواز منہ دوش لگتی تھی.. یہ غلط نمبر تھا..

”آپ نہیں جانتے؟“

”نہیں...“

”یہ سب کچھ اچانک تھا.. وہ اکثر آپ کا تذکرہ کرتی تھیں ایک فلکسیشن تھی آپ کے لئے.. اور اب بہت خوش ہوتے تھے انہیں چھیڑتے تھے اور وہ سرخ ہو جاتی تھیں.. جی سر... آپ نہیں جانتے مگر شی واز اے گریٹ فین آف یورس.. ان کا دسواں ہے پرسوں.. آپ اگر آسکتے ہیں تو... شی دل بی ویری پی...“

اس کا ذہن منجمد ہو گیا.. جیسے ہزاروں برسوں کی برف انٹارکٹک میں بے حس اور سرد ہوتی ہے اور اس کے نیچے کئی کلو میٹر کی گہرائی میں کوئی ایک جھیل پوشیدہ ہوتی ہے جو اپنے بھید عیاں نہیں کر سکتی.. ”آئی ایم سوری بیٹے... یہ کیسے ہوا؟“

”ہمیں ان سے بہت شکایت ہے...“ نوجوان جسے اپنے حواس اور آواز پر ابھی تک مکمل اختیار تھا، ہچکیاں لینے لگا۔ ”انہیں معلوم تھا لیکن انہوں نے ہمیں بتایا نہیں.. چھپائے رکھا.. ایک پیچیدہ قسم کا کنسر تھا اور اس کی تشخیص ہونے پر انہوں نے ہمیں بتایا نہیں... وہ... ہمیشہ اپنے ہینڈ بیگ میں سے گولیاں اور کیپسول نکال کر پھاںکتی رہتی تھیں اور کہتی تھیں کہ یہ وٹامن ہیں... اور پھر... دو تین روز کے اندر اندر.. آپ کسی وقت ہمارے ہاں آئیں انکل.. اماں کی وجہ سے ہم بھی آپ کو اپنا اپنا محسوس کرتے ہیں.. ابھی لوگ آ رہے ہیں..“

نہ اسے کبھی اس کے وجود کا یقین آیا تھا اور نہ ہی اب اس کے عدم وجود سے مفاہمت ہو رہی تھی.. یہ دونوں وہم کے پرندے تھے جو اس کی ذات کے گھونسلے میں اترے تھے..

اس کے ہونے کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا...

اسے بارہ کھو کی پہاڑیوں میں جا کر اس بڑے پتھر کی کوکھ میں جھانکنا چاہئے.. یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا وہاں واقعی خور و نوش کی کچھ چیزیں ہیں جو شاید وہ آخری بار وہاں رکھ کر

گئی ہو... اپنے ہونے کے نشان کے طور پر...

بس یہی توجہ تھی اس کے مختلف اجزاء سے بنے ہوئے کردار کی.. اس کی شخصیت کے الجھاؤ کی.. تشخیص کے بعد ہی اس نے فیصلہ کیا ہو گا کہ وہ اس مہلت کے اندر اندر جو اسے ملی تھی وہ کچھ کر گزرے جو اس کا جی چاہتا تھا..

تبھی وہ روتی بہت تھی..  
اپنی موت کے لئے خود ہی پیشگی روتی رہتی تھی..  
غلامی آنکھوں میں اسی لئے آنسو بہت تھے..

موت کے ڈرامے میں نیلے دھبوں کے بدن کے ساتھ وہ... عابدہ سومر د اداکاری کرتی تھی.. اگرچہ ان لمحوں میں جب وہ سٹیج پر ہوتی تھی 'اپنے کردار میں ڈوب کر حقیقت ہو جاتی تھی.. اور وہ جسے مرگ کی سٹیج پر دھکیل دیا گیا تھا 'ظاہر نہ کرتی تھی.. صرف آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ ایک بڑی اداکارہ ہے.. اسے بہترین اداکاری کا کوئی بھی ایوارڈ نہیں مل سکتا تھا..  
وہ اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا..

لاسٹ ٹینکوان پیرس کی طرح... میں تو اس شخص کا نام بھی نہیں کا نتی...  
کل کلاں کسی بھی قبرستان میں کسی کتبے کو پڑھ کر وہ یہی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ..  
یہاں دفن ہے...

ملاحا... حاحا...

ہالی نہ پڑی ٹھیل ساڈھے یار و نجباں  
پکھتی کا دراوڑی بدن... رات کے سیاہ اکھا پے میں.. کہ الاؤ کی طرف کسی نے دھیان نہیں کیا تھا اور وہ راکھ میں بدل چکا تھا.. تو پکھتی کا دراوڑی بدن گھنے سروٹوں پر اپنے سائے بھیجتا تھا 'اپنے پچھلے جنم کو لوٹا تھا 'بے خود 'بے راہرو اور آزاد ہوتا تھا.. اس کے کوہلوں پر ابھی تک ریت کے ذرے چمٹے ہوئے تھے... اور اس کی چھاتیوں میں مونہ جو فلدو کے پریسٹ کنگ کا تختہ الٹ دینے کی صلاحیت تھی...

فہیم بازو بلند کئے... سرور کی پرات کی تال پر حرکت کرتا ہوا... اماں جعفر جھکا ہوا

ہونی کی مُشک میں رچا ہوا اور ان دونوں کے درمیان پکھی اپنے پچھلے جنم میں رات کی سیاہی کو اپنی سیاہ تر آنکھوں سے چیرتی.. ان دونوں کی موجودگی سے لا پرواہ اپنے آپ میں گم ناچتی تھی۔

الاؤ کے گرد جو ہانڈیاں اور برتن خوراک کے دھرے تھے.. اس آس میں پڑے تھے کہ گرم رہیں گے وہ اب ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان پر راکھ کی تہہ جمی جاتی تھی۔  
خاور کو بھی بھوک نہ تھی..

اگرچہ اس نے فہیم سے خصوصی فرمائش کر کے سنگھاڑا پھیل کا سالن بنوایا تھا  
حلوے کی خواہش کی تھی لیکن اس کی اشتہا خست ہو چکی تھی..

وہ تینوں اس کے وجود سے بھی غافل ہو چکے تھے.. وہ ان کے لئے فالتو ہو چکا تھا  
کیونکہ کوچ کا نگارہ بچ چکا تھا وہ اگلی صبح گھروں کو لوٹ رہے تھے اس لئے اس کی ضرورت باقی  
نہیں رہی تھی..

ریت کی گرفت میں سے خاور نے اپنے آپ کو ذرا زور لگا کر اٹھایا.. کچھ دیر انہیں  
دیکھتا رہا.. یہی وہ لمحے تھے اس بیابان میں.. اس سردیوں سے گھر سے جزیرے میں جو ان  
تینوں کو اس سے ممتاز کرتے تھے.. وہ برتر ہوتے تھے اور وہ حقیر ہوتا تھا کہ وہ اپنے تہذیبی  
پس منظر میں اسیران کی روح میں شامل نہیں ہو سکتا تھا اور وہ تینوں قیود میں نہ تھے آزاد  
تھے..

خاور نے ابھی تک پکھی کے کولہوں سے چٹنی ریت کو دیکھا اور پھر اپنی پشت کو  
جھاڑ کر ان سے پرے ہو کر سردیوں اور سرکنڈوں کی جانب چلنے لگا..  
انہوں نے ذرا اوم لے کر اس سے نہیں پوچھا کہ سائیں کدھر جاتے ہو.. کہ وہ اس  
سے غافل ہو چکے تھے.. ہاں پکھی کے کولہوں نے اور چھاتیوں نے اس پر ایک نظر کی اور پھر  
سے اپنے پچھلے جنم میں چلے گئے..

سردیوں پر ان تینوں کے سایوں کا کھیل حرکت کرتا تھا..  
وہ ان کی پر چھائیوں سے ان تینوں کو الگ الگ پہچان سکتا تھا..  
جو سایہ سرکنڈوں سے بھی اوپر نکلتا تھا وہ فہیم تھا.. جھکا ہوا.. کچھ تلاش کرتا سایہ  
جعفر کا تھا اور ان کے بیچ پکھی کی پر چھائیاں سرور کی تال کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں..

پر چھاننیوں کے اس کھیل کے اندر خاور نے قدم رکھا تو سروٹ شروع ہو گئے۔ ان کی شانیں تیکھی اور تیز دھار کی تھیں۔ وہ اندھیرے میں ان میں راہ بنانا، اپنے ہاتھ پھیلائے ان میں سے راہ بنانا آگے ہوتا تھا تو اس کے گالوں اور ہاتھوں پر ان کی دھاریں وار کرتی تھی اور خراشوں میں سے خون پھوٹتا تھا۔

سروٹوں سے نکل کر ریتلے کنارے کم اندھیرے میں تھے اور کشتی نظر آرہی تھی متعدد کھونٹوں سے بندھی رسوں میں جکڑی کشتی اتنی مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی کہ پانیوں میں کسمسا بھی نہیں سکتی تھی۔ نہ یہاں سروٹ کی پرات کی تھاپ سنائی دیتی تھی اور نہ یہ شک ہوتا تھا کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ذخیرے کے اندر تین وجود جھومر ڈال رہے ہیں کیونکہ انہیں رہائی کی خبر مل چکی ہے۔ کشتی سے ذرا فاصلے پر ریت کا ایک ابھار تھا۔

رات میں وہ پوری طرح عیاں تو نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا ابھار ایک گمان کی صورت میں اس کا پتا دیتا تھا اور جب وہ کنارے کی ریت پر چلتا ہوا اس تک پہنچا تھا تو قدم بتاتے تھے کہ اب وہ اوپر اٹھ رہے ہیں۔

آلتی پالتی مارے ہوئے وہاں بیٹھا بہت دیر تک وہ ایک تار یک خلا میں رہا۔ ایک ریت پر رہ جانے والے ڈولفن کی مانند ناپید رہا۔ اور یہاں سے۔ اگر ایک شخص بہت دیر تک آنکھیں جھپکاتا رہے تو اسے احساس ہوتا تھا کہ کشتی کے پہلو میں سے نکلتی ایک سیاہ چادر ہے جو دھیرے دھیرے بدلتی ہے۔ ہولے ہولے بہتی ہے۔

سندھ ساگر اس کے لئے۔ ایک عارضی پڑاؤ تھا جہاں سے اس نے کل سویرے کوچ کر جانا تھا۔ لیکن کہاں جانا تھا۔ اس کے بارے میں مکمل ناپیدائی تھی۔ عابدہ سومر د جانتی تھی کہ ایک عارضی پڑاؤ کے بعد کہاں جاتے ہیں۔ غلامی آنکھوں کو بھی خبر مل چکی تھی کہ اس نے کہاں جانا ہے۔ ان دونوں نے اسے ایک عارضی پڑاؤ کے طور پر استعمال کیا تھا اور چلی گئی تھیں۔ سلطانہ اگرچہ تھی لیکن وہ اسے ناظم الدین روڈ پر مڑنے کی بجائے سیدھا چلے جانے کی خواہش کا اظہار کرنے کے باوجود سب کچھ فراموش کر کے لا تعلق ہو سکتی تھی۔ سری لنکا سے واپسی پر ایئر پورٹ پر اسے پہچانے بغیر آگے جاسکتی تھی۔ جیسے لا تعلق سے ایک عارضی پڑاؤ کو چھوڑ کر آگے جایا جاتا ہے۔

ہوا پہلو بدلتی ہوئی آئی تو سروٹوں کی جانب سے سروٹ کی پرات کی تال لمحے بھر